حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری

حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی
(دوسری قسط)
سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند انڈیا، حال استاذ: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

غارِحراء کی زیارت

مسجدِحرام سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ جاتے ہوئے بائیں طرف ایک پہاڑ ''جبلِ نور'' کے نام سے واقع ہے، اس پہاڑ کی چوٹی پر غارِحراء ہے، جہاں سیدالکونین ﷺ نے نبوت ملنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے خلوت گزینی اختیار فرمائی تھی، آپ ﷺ کھانے پینے کا کچھ ضروری سامان ساتھ لے کر تشریف لے جاتے، اور کئی کئی دن خلوت فرماتے، ''الدرالمختار'' (ج:۱،ص:۲۶۳) کی تصریح کے مطابق غارِحراء میں آپ ﷺ دینِ ابراہیمی کے مطابق عبادت فرماتے، اور جب سامان ختم ہوجاتا تو واپس تشریف لاتے اور کچھ ضروری سامان لے جاتے اور پھر خلوت گزینی اختیار فرماتے، غارِحراء کا سائز اتنا ہی ہے کہ کوئی معقول قد کا آدمی تنہا اس میں بیٹھ سکتا ہے، لیٹ سکتا ہے اور کھڑا بھی ہوسکتا ہے، اس غار کے بند دہانے میں ایک عمودی پتلی سی درز ہے، جس سے اُس زمانے میں کعبۃ اللہ صاف نظر آتا تھا، البتہ آج کل مسجدِحرام کی اونچی عمارت کی وجہ سے کعبۃ اللہ تو نظر نہیں آتا، مسجدِحرام کی عمارت نظر آتی ہے۔

غارِحراء میں آپ ﷺ کی خلوت گزینی کا سلسلہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل علیہ السلام پہلی وحی لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''اقرأ'' (پڑھیے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پڑھنا جانتے ہیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو دبوچا اور خوب دبوچا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی قوت جواب دینے لگی، پھر چھوڑ دیا اور کہا: ''اقرأ'' (پڑھیے) آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے پھر اسی طرح دبوچا اور پھر چھوڑ کر کہا: ''اقرأ'' (پڑھیے) آپ ﷺ کا جواب پھر بھی وہی رہا، حضرت جبریل علیہ السلام نے جب تیسری مرتبہ اُسی طرح دبوچا اور پھر چھوڑ دیا تو کہا: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُ '' آپ ﷺ کے اندر تحمل وحی کی استعداد پیدا ہوچکی تھی، آپ ﷺ نے پڑھنا شروع کردیا اور یہیں سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا، جو آپ ﷺ کی وفات تک جاری رہا۔

بہرصورت! غارِحراء کی زیارت کے لیے ہم چاروں ساتھی بروز بدھ ۱۸ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱رنومبر ۱۹۸۷ء بعدالعصر جبل نور پہنچ گئے، اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا، پہاڑ کی چڑھائی درمیان تک زیادہ کٹھن نہ تھی، درمیانی بلندی سے اوپر پہاڑ کی چوٹی تک جانے میں بڑی احتیاط وہمت کی ضرورت تھی، اس لیے کہ پہاڑ کے ایسے حصوں سے بھی گزرنا پڑتا جہاں چڑھنے والا اپنا جسم ترچھا کرکے پنجوں اور پاؤں کی مدد سے آگے سرکتا ہوا بڑھ سکتا تھا، احقر کے دل میں یہ احساس موجزن تھا کہ جن پتھروں کو آج ہم چھورہے ہیں یہ وہی پتھر تو ہیں جن کو تقریباً چودہ سو اکتیس سال قبل (۱۴۰۸ھ کے اعتبار سے) نبی کریم ﷺ نے چھوا تھا، اور جن پر آپ ﷺ کی مبارک نظریں ضرور پڑی ہوں گی اور اس پر بھی غور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ تو سنِ کہولت میں اس دشوارگزار پہاڑی کی چوٹی پر واقع غارِحراء تک بار بار تشریف لے جاچکے ہیں، اور آپ ﷺ کے اُمتی ہونے کا دعویدار یہ سیاہ کار اپنی جوانی (میری عمر اس وقت چھبیس سال کے لگ بھگ تھی) میں ہمت ہار کر صرف ایک مرتبہ چڑھنے میں بھی کاہلی سے کام لے تو یہ ہرگز مناسب نہیں، شاید اسی احساس وجذبے نے احقر کو اپنے ساتھیوں سے پہلے اور راستے میں توقف کیے بغیر غارِحراء تک پہنچا دیا۔

اس تاریخی سفر کے بعد سے تادمِ تحریر جو تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اپنے رفیقِ سفر جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب سے وقفہ وقفہ سے دو ملاقاتیں اور ایک مرتبہ فون پر بات ہوئی ہے، تینوں دفعہ انہوں نے جبل نور پر احقر کے چڑھنے کے انداز کا تذکرہ ضرور فرمایا ہے، غارِحراء میں کم ازکم دو رکعت نفل نماز ادا کرنے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن چونکہ ہم لوگ عصر پڑھ کر نکلے تھے، اس لیے نوافل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، اور زیارت ودعاؤں پر اکتفاء کرتے ہوئے ہم لوگ واپس ہوگئے۔

غارِحراء کی زیارت سے تین باتوں کا ذہن نشین ہوجانا

غارِحراء کا دشوارگزار راستہ طے کرنے اور اس کی زیارت کرنے کے موقع پر تین باتیں خاص طور پر ذہن نشین ہوگئیں:

پہلی بات: ہرداعیِ حق، عالمِ دین اور خادمِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے غارِحراء جانے کے لیے جبل نور پر بار بار چڑھنے کی مشقت کو سہنے اور اس کے بعد ۲۳رسالہ نبوت کی زندگی میں گوناگوں تکالیف جھیلنے اور مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی میں مشقت برداشت کرنے، محنت کرنے اور سادگی اختیار کرنے کو ترجیح دے، تاکہ وہ دعوت وتبلیغ، دینی علوم کی تعلیم اور آوازِحق پھیلانے کے لیے درکار محنت کا عادی بن کر مخالفین کی اذیتوں کو برداشت کرنے

کے لیے تیار رہے، اور اگر خدانا خواستہ اس نے اپنے نبی ﷺ کے طریقہ کو چھوڑ کر دنیا داروں اور تعیش پرستوں کے طرزِ زندگی کو اختیار کیا اور آرام طلبی وسہولت پسندی اس کے مزاج میں داخل ہوگئی تو ایسی صورت میں نہ تو وہ دینی تعلیم وتبلیغ کے لیے بے لوث محنت کر سکے گا، اور نہ ہی مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنے کا مادہ اپنے اندر پائے گا، اور بالآخر دنیا داروں اور سہولت پسندوں کی فہرست میں شامل ہوجائے گا۔ والعیاذ باللہ۔

دوسری بات: ایک عام مسلمان اور بالخصوص عالمِ دین وداعیِ حق کے لیے چاہیے کہ اپنے نبی ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے کھانے پینے میں احتیاط برتے، تاکہ جسم فربہ نہ ہونے پائے اور پیٹ اپنے حدود میں رہے، اس لیے کہ جسم فربہ ہونے اور پیٹ باہر کی طرف نکلنے کی صورت میں تگ ودَو مشکل ہوتی ہے، اور بوقتِ ضرورت دشوار گزار راستوں کو عبور کرنا اور اونچائیوں پر چڑھنا دشوار ہوجاتا ہے، آقائے نامدار ﷺ کا بار بار جبلِ نور پر چڑھنا اور کئی کئی دن تک کھانے پینے کے ایک معمولی سامان پر اکتفا کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ آپ ﷺ کا جسم مبارک چست، موزوں اور اپنے کنٹرول میں تھا، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ھند بن ابی ہالہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے آپ ﷺ کا جو حلیہ مبارک نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے: ''**سواءَ البطن والصدر** ''یعنی آپ ﷺ کا پیٹ اور سینہ مبارک دونوں ہموار تھے، اور اسی روایت میں آگے یہ لفظ بھی ہے: ''**ذَریع المِشیة**'' یعنی آپ ﷺ تیز رفتار تھے۔ (شمائل ترمذی، ص:۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری کے اندر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بعد میں آنے والے ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو خیانت اور دیگر گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ ان میں موٹاپا ظاہر ہوجائے گا، چنانچہ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''**إنّ بعدکم قومًا یخونون ولایؤتَمَنون ویشھدون ولایُستشھدون ویَنذُرون ولایَفون ویظھر فیھم السِّمَن۔**''
>
> ''بے شک تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو خیانت کریں گے اور امانت داری سے کام نہیں لیں گے، اور گواہی دیں گے جب کہ وہ گواہ نہیں بنائے گئے ہوں گے، اور منتیں مانیں گے اور اُنہیں پوری نہیں کریں گے، اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوجائے گا۔''

مذکورہ حدیث کی تشریح میں بخاری شریف کے حاشیہ کے اندر کرمانی کے حوالہ سے لکھا ہوا ہے:

> ''یعنی لوگوں کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا اور دنیوی خواہشات کے پیچھے چلنا رہ جائے گا، آخرت سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔''

راقم عرض کرتا ہے کہ ایسے لوگوں پر سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا مندرجہ ذیل شعر بھی منطبق ہوتا ہے:

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است

ایں معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

تیسری بات: مصلحینِ امت ومشایخ طریقت نے مدارجِ سلوک طے کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے کے لیے چلّہ کشی اور گوشہ نشینی کو جو اہمیت دی ہے، اُس اہمیت پر غارِ حراء کے واقعہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے، چنانچہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۵۰۵ھ) نے اپنی مایۂ ناز کتاب ''احیاء علوم الدین'' جلد ثانی میں گوشہ نشینی کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اس کے چھ فوائد ذکر کیے ہیں، اور فائدہ اولی کو بیان کرتے ہوئے اس کے ضمن میں غارِ حراء کے اندر نبی کریم ﷺ کی خلوت وگوشہ نشینی سے استدلال فرمایا ہے۔

اسی طرح حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیو بند مدظلہم العالی نے تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد اول، ص: ۱۳۹ پر خلوت گزینی کی افادیت کو بیان کرتے ہوئے اپنے شیخ حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہٗ کا یہ ملفوظ نقل فرمایا ہے:

''جس نے لوگوں سے دوری اختیار کی اور تنہائی کو پسند کیا وہ اگر ٹھیکری (مٹی کے برتن کا بے وقعت ٹکڑا) بھی ہوگا تو ہیرا بن جائے گا، اور جو لوگوں کے ساتھ تعلقات کا خواہاں ہوتا ہے اور یارانہ گانٹھنے کا شوقین ہوتا ہے وہ اگر ہیرا بھی ہوگا تو ٹھیکری بن جائے گا۔''

غارِ حراء کی زیارت سے فارغ ہوکر ہم لوگ واپس مسجدِ حرام آگئے، اور چونکہ اگلے دن ہی مدینہ منورہ جانا تھا، اس لیے کوشش یہ رہی کہ جو مختصر وقت ہمارے پاس ہے اس کا بیشتر حصہ مسجدِ حرام کی بابرکت فضاء میں گزر جائے، چنانچہ پوری رات مسجدِ حرام میں رہے، اور اگلے دن مدینہ منورہ جانے کا پروگرام بنایا۔

کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف

ہمیں چونکہ بہت مختصر وقت کے لیے جامعۃ الملک سعود ریاض سے عمرہ اور زیارتِ حرمین شریفین کے لیے تحریری اجازت نامہ ملا تھا، جس کے تحت ہم بروز منگل ۱۷؍ربیع الاول کو ریاض سے روانہ ہوگئے تھے، اور بروز ہفتہ ۲۱؍ربیع الاول کو واپس ریاض پہنچ کر جامعہ میں صبح کے وقت اپنے اسباق میں حاضری دینی تھی، اس مختصر وقت میں ہمیں عمرہ بھی کرنا تھا، اور مدینہ منورہ جاکر مسجد نبوی اور روضۂ اقدس پر حاضری بھی دینی تھی، اس لیے بروز جمعرات ۱۹؍ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۲؍نومبر ۱۹۸۷ء رخصت ہونے کے ارادہ سے کعبۃ اللہ کا طواف کرکے ملتزم پر آکر حزن وملال اور اس دعا کے ساتھ رخصت ہوئے کہ:

''یا اللہ! یا مجیب الدعوات! بار بار صحت وعافیت، ایمان ویقین اور استقامت ومخلصانہ

محبت کے ساتھ حاضری کی توفیق عنایت فرما۔‘‘

حرمین شریفین کی زیارت کے لیے بچپن سے جوتمنائیں دل میں موجزن تھیں ان تمناؤں کی تکمیل اگر چہ اتنے مختصر وقت میں نہیں ہوسکتی تھی اور ہمیں ایک مختصر حاضری کے بعد دوبارہ فراق وجدائی کا حزن وملال لاحق تھا، اور دل میں ایک بے چینی کی کیفیت تھی، اس بے چینی کی کیفیت میں احقر کبھی اپنے آپ کو مخاطب کرکے کہتا کہ تم اتنے مختصر وقت میں کیوں واپس جارہے ہو؟ اُدھر سے جواب ملتا کہ جب وقت ہی مختصر ملا تو اب کیا کہا جاسکتا ہے؟ میرے اس ’’مکالمۂ نفسی‘‘ پر حافظ شیرازیؒ کا مندرجہ ذیل شعر منطبق ہورہا تھا:

گفتم کہ نہ وقتِ سفرت بود چنین روز
گفتا کہ مگر مصلحتِ وقت چنیں بود

دردِفراق کی وجہ سے اگرچہ ہمیں غیر اختیاری ملال لاحق تھا، تاہم اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام پر کہ اس نے اپنے دربار میں حاضری، کعبۃ اللہ کی زیارت اور طواف اور غلافِ کعبہ پکڑنے کا موقع عنایت فرمایا ہے، ہمارے قلوب غمِ فراق کے ساتھ ساتھ شکرِ خداوندی کے جذبات سے بھی لبریز تھے، اور بقول شاعر ہماری کیفیت کچھ اس طرح بھی تھی:

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است — افتم بہ پائے خود کہ بہ کویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ دہم دست خویش را — کودامنت گرفتہ بہ سویم کشیدہ است

ترجمہ ومفہوم: ’’مجھے اپنی آنکھوں پر فخر ہے جنہوں نے آپ کے جمال کا نظارہ کیا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ ہر گھڑی اپنے ہی ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیا کروں، کیونکہ انہوں نے آپ کا دامن پکڑکر میری طرف سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔‘‘

مدینہ منورہ روانگی

بروز جمعرات کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کے ارادہ سے ہم چاروں روانہ ہوگئے، راستہ میں کبھی یہ تصور قائم ہوتا کہ حرمین شریفین کے درمیان کا راستہ آقائے دو جہاں ﷺ نے اپنے یارِ غار ورفیقِ سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت فرماتے ہوئے کتنی مشقت کے ساتھ طے کیا تھا! اور آج ان کی قربانیوں کی بدولت وہی راستہ ہم لوگ کتنی آسانی اور امن وامان کی فضا میں طے کررہے ہیں! ان نعمتوں کا شکر ہم کیسے ادا کریں گے! اور کبھی ان پہاڑیوں اور ریگستانوں کو جو اپنی پرانی حالت پر باقی تھے اور نئے نئے روڈوں اور جدید تعمیرات نے ان کے حلیہ کو متاثر نہیں کیا تھا، اس وجہ سے ہم خصوصی طور پر محبت وعقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ شاید مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان آتے جاتے ان پر نبی کریم ﷺ یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک

قدموں کے نشانات یا مبارک نظریں پڑی ہوں گی، ان ہی تصورات کے ساتھ جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھتے رہتے، شوقِ مدینہ میں اضافہ ہوتا رہتا:

کسی چیز کی اس کو حسرت نہیں ہے
میسر ہو جس کو غبارِ مدینہ

مسجدِ قبا کی زیارت اور اس کا ذکرِ خیر

ہم لوگ حسبِ توفیق درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے مندرجہ بالا تصورات کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف والہانہ انداز میں بڑھ رہے تھے، یہاں تک کہ عصر تک محلّہ ''قباء'' میں پہنچ کر عصر کی نماز ''مسجد قباء'' میں ادا کی، قباء نبی کریم ﷺ کے دور میں مدینہ منورہ کی بالائی جانب تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں کا نام تھا، جہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے لوگ آباد تھے، اب وہ مدینہ منورہ میں شامل ہوگیا ہے، بخاری شریف جلد اول، صفحہ نمبر: ۵۵۹ تا ۵۶۰ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے قبل یہاں پر قیام فرمایا تھا، اور چودہ دن رہے تھے، بخاری شریف جلد اول، صفحہ: ۵۵۵ کی ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے اسی دوران اُس مسجد (مسجدِ قباء) کی بنیاد رکھی، جس کے بارہ میں (قرآن پاک کے اندر) فرمایا گیا ہے: ''أُسِّسَ علی التقویٰ ''یعنی وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایة والنهایة '' جلد ثانی، صفحہ: ۵۹۹ پر ایک حدیث کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس مسجد میں جانبِ قبلہ کی نشاندہی نبی کریم ﷺ کے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمائی تھی، اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں عام مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے یہی مسجد بنائی گئی، ہاں! ایک مسجد اس سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے گھر کے دروازہ کے پاس ضرور بنائی تھی، لیکن وہ صرف اپنی ذاتی عبادت کے لیے تھی، عام مسلمانوں کے لیے نہیں تھی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس مسجد کا تذکرہ بخاری شریف کی روایت میں صفحہ: ۵۵۳ جلد اول میں بھی موجود ہے۔

حاصل یہ! کہ ''مسجد قباء'' عام مسلمانوں کے لیے بنائی گئی سب سے پہلی مسجد ہے، اور نبی کریم ﷺ نے خود اس کی بنیاد رکھی ہے، اور اس کی تعمیر میں بھی حصہ لیا ہے، اس مسجد کا ذکرِ خیر قرآن پاک سورۂ توبہ آیت: ۱۰۸ میں بھی موجود ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ ہر ہفتہ کے دن کبھی سواری پر اور کبھی پیدل ''مسجدِ قباء'' تشریف لے جایا کرتے تھے، اور نبی کریم ﷺ کی اتباع میں خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہر ہفتہ کے دن ''مسجدِ قباء'' تشریف لے جایا کرتے تھے، اور وہاں پر دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ (بخاری شریف، ج:۱، ص:۱۵۹)

اسی طرح امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ نے حضرت اُسید بن ظُہیر انصاری اور حضرت سہل بن حُنیف رضی اللہ عنہما کی روایت سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

''مسجد قباء کی نماز کا ثواب عمرہ کے ثواب کے برابر ہے''۔ (ترمذی، ج:۱،ص:۴۷۔ نسائی، ج:۱،ص:۱۱۴۔ ابن ماجہ:۱۰۲)

مسجدِ قباء کے مذکورہ بالا فضائل کو سامنے رکھتے ہوئے جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بعد تمام مساجد میں سب سے افضل مسجدِ قباء ہے، ہم سب رفقائے سفر کو اس بات پر خوشی تھی کہ ہمیں اس مسجد کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کی سعادت ملی، اور خود بخود ایک ایسی صورت بن گئی کہ ہمیں مسجدِ نبوی کے حدود تک پہنچنے سے قبل مسجدِ قباء کے حدود میں عصر کی نماز کی ادائیگی کے لیے رُکنا پڑا، اور نبی کریم ﷺ کے سفرِ ہجرت کے ساتھ ایک ادنیٰ شباہت کی صورت پیدا ہوگئی، کیونکہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے یہاں قیام فرمایا تھا۔

مسجدِ قباء سے مسجدِ نبوی کی حاضری کے لیے روانگی

عصر کی نماز اور مسجدِ قباء کی زیارت سے فارغ ہوکر ہم مسجدِ نبوی کی طرف روانہ ہوگئے، تھوڑی دیر کے بعد مسجدِ نبوی کے پُرنور میناروں اور مزید آگے چل کر باعظمت گنبدِ خضراء پر نظریں جم گئیں، دل دھڑکنے اور آنسو ٹپکنے لگے، اور آگے چونکہ مسجدِ نبوی اور روضۂ اقدس پر حاضری کا مرحلہ تھا، تو کبھی اس سوچ کا غلبہ ہوجاتا کہ آقائے دو جہاں ﷺ کے مواجہہ شریف پر اپنی بداعمالیوں اور اپنے گناہ گار وخطاکار چہرے کے ساتھ حاضری دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، لہٰذا! اَقدامِ عالیہ کی جانب سے اپنی نظریں چھپا کر سلام پیش کرنا میرے حق میں مناسب ہوگا، پھر یہ خیال آتا کہ آپ ﷺ تو اپنی جان کے دشمنوں تک کو بھی معاف فرماتے تھے، اور آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنے والوں میں سے ہر شخص آپ ﷺ کے اچھے سلوک و بلند اخلاق کو دیکھ کر یہ تصور کرتا کہ شاید آپ ﷺ سب سے زیادہ مجھ سے محبت فرماتے ہیں، اور خود رب العزت نے آپ ﷺ کے حق میں سورۂ توبہ آیت:۱۲۸ میں ارشاد فرمایا ہے:

''حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔''

ترجمہ:''وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند رہتے ہیں اور مسلمانوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔''

اسی طرح سورۂ نساء آیت نمبر:۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَآؤُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا۔''

ترجمہ: ''اور جب لوگوں نے (تمہاری نافرمانی کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا تھا، اگر اسی وقت تمہارے پاس حاضر ہوجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (ﷺ) ان کے لیے بخشش طلب کرتے تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہرباں ہے۔''

آیتِ مذکورہ کے حکم کا تعلق اگرچہ براہِ راست تو کسی ایسی جماعت سے ہے جو آپ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی، تاہم اربابِ علم اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے مزارِ اقدس پر حاضری دینے والوں سے بھی جوڑ دیتے ہیں، یہاں تک کہ مشہور مفسّر ومحدّث حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۷۷۴ھ) نے اپنی مایۂ ناز تفسیر میں آیتِ مذکورہ کے تحت ''عُتبی'' رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشہور قصہ نقل کیا ہے:

''میں نبی پاک ﷺ کے مزارِ اقدس کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صحرانشین شخص آیا اور ''السلام علیک یارسول اللّٰہ!'' کہہ کر عرض کرنے لگا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے، جو فرماتے ہیں: ''وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَآؤُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا'' اور میں اپنے گناہوں پر استغفار کرتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور اپنے پروردگار کے حضور میں آپ سے شفاعت کی التجاء کرتا ہوں۔ پھر مندرجہ ذیل دو نعتیہ شعر پڑھ کر چلا گیا:

يَا خيرَ من دُفِنَتْ بالقاعِ أعظُمُهُ   فطاب من طيبهنّ القاعُ و الأكَم

نَفسي الفداء لِقبرٍ أنت ساكنهُ   فيه العفافُ و فيه الجودُ و الكرمُ

ترجمہ: ''اے ان تمام ہستیوں سے برتر ہستی! جن کی ہڈیاں (اجسام مبارکہ) ہموار زمین میں دفن ہوچکی ہیں، اور ان کی خوشبو سے ہموار زمین و پہاڑیاں مہک اُٹھی ہیں، میری جان قربان ہو اس قبر پر جس میں آپ آرام فرمارہے ہیں، اس قبر میں تو پاک دامنی اور جود و کرم سب قیام پذیر ہیں۔''

عُتبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ شخص تو چلا گیا اور مجھے نیند آگئی اور خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عُتبی! اس صحرانشین شخص سے جاکر ملو اور یہ خوشخبری سنادو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔'' (تفسیر ابن کثیر، ج:۱،ص: ۶۳۵، مطبوعہ ریاض)

احقر کہتا ہے کہ اس موقع پر اُس مرفوع حدیث نبوی کی طرف بھی ذہن منتقل ہوا جس میں آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضری دینے کی ترغیب دی گئی ہے، اور اُس حاضری کو آپ ﷺ کی شفاعت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، مذکورہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ مروی ہے، اور ہر سند پر انفرادی طور پر اگرچہ محدثین نے کلام کیا ہے، تاہم امام ذہبی، ابوعلی بن السکن، تقی الدین سبکی

اور شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدثین نے کثرتِ طرق کی بنیاد پر اس کی اہمیت ومضبوطی کو تسلیم کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: التلخیص الحبیر لابن حجر، ج:۲،ص:۵۷۰،مطبوعہ بیروت۔فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناوی، ج:۶،ص:۱۴۰،مطبوعہ بیروت)

مذکورہ بالا وجوہات اور اُمتِ مسلمہ کا قرناً بعد قرنٍ آپ کے مزارِ اقدس پر حاضری دینے کے لیے سفر کرنے کے تعامل کو مدنظر رکھتے ہوئے جمہور علماء نے اس حاضری کو افضل المندوبات اور اعظم القربات بلکہ بعض نے تو (اہل استطاعت کے لیے) واجب قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: معارف السنن للشیخ العلّامۃ البنوری، ج:۳،ص:۳۲۹ تا ۳۳۵)

خلاصہ یہ کہ مسجدِ قباء اور مسجدِ نبوی کے درمیان کا راستہ طے کرنے کے دوران اپنی کوتاہیوں پر غور کرتا ہوا شروع شروع میں اپنے اندر یہ ہمت نہیں پا رہا تھا کہ مسجدِ نبوی میں حاضری کے بعد سلام پیش کرنے کے لیے مواجہہ شریف پر حاضری دوں گا، بلکہ اپنے حق میں یہی بہتر سمجھتا تھا کہ اَقدامِ عالیہ کی جانب سے سلام پیش کروں گا، لیکن جب مندرجہ بالا امور کا اجمالی طور پر ذہن میں استحضار ہوا تو کچھ ہمت سی پیدا ہوگئی، اور یہ بات ذہن نشین ہونے لگی کہ اپنی زیادتیوں اور بداعمالیوں کے باوجود نبی کریم ﷺ -جن کی صفت ’’حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ‘‘ ہے- کے دربارِ عالی میں شرمندگی وندامت کے احساس کے ساتھ مواجہہ شریف کی جانب سے حاضر ہونا مناسب رہے گا۔

روضۂ مبارک پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت

روضۂ اقدس پر جب مواجہہ شریف کی جانب سے سلام پیش کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، اور یہ تصور بھی قائم ہوگیا کہ آج تو صیغۂ حاضر کے ساتھ صلاۃ وسلام پیش کرنے کا موقع نصیب ہو رہا ہے، اور اس حدیث کا تصور بھی جو امام احمد بن حنبل اور امام ابوداود رحمہما اللہ نے مضبوط سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ آپ ﷺ ایسے موقع پر سلام کا جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔ (التلخیص الحبیر، ج:۲،ص:۵۷۰)

اس تصور سے دل ودماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس سے وہ ساری تمنائیں اور حاجتیں ذہن سے غائب ہوگئیں جن کے متعلق چلتے وقت یہ منصوبہ بنایا تھا کہ روضۂ اقدس پر حاضری کے دوران سلام پیش کرنے کے بعد ان تمناؤں اور حاجتوں کے حصول کے لیے آپ ﷺ کے توسل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کروں گا، اس لیے کہ بارگاہِ نبوی میں حاضری کی تمنا جب پوری ہوگئی تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ تمام تمنائیں پوری ہوگئیں، اب مزید کسی تمنا کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اُس وقت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر میری کیفیت پر منطبق ہو رہا تھا:

ارباب حاجتیم وزبانِ سوال نیست
در حضرتِ کریم تمنا چہ حاجت است؟

ترجمہ ومفہوم: ’’ہم حاجت مند تو بے شک ہیں، لیکن زبان میں سوال کرنے کی ہمت نہیں رہی، کیونکہ دربارِ کریم میں حاضری کی تمنا جب پوری ہوگئی تو مزید کسی تمنا کی ضرورت کیا ہے؟۔‘‘

بہرصورت! صلوٰۃ وسلام کے کلمات عربی زبان میں ذرا پست آواز کے ساتھ پیش کرنے کے بعد دل نے چاہا کہ فارسی زبان میں مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۸۹۸ھ) کے اس قصیدہ نعتیہ میں سے چند منتخب اشعار پڑھنے کی کوشش کروں جو بتیس اشعار پر مشتمل اور ان کی مشہور ومعروف کتاب ’’یوسف زلیخا‘‘ کے شروع میں درج ہے، میں نے بچپن میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے پاس ’’یوسف زلیخا‘‘ پڑھتے ہوئے وہ قصیدہ پڑھا تھا، اور والد ماجد مجھے پڑھاتے ہوئے یا کبھی خود اُسے پڑھتے ہوئے آنسو بھی بہاتے تھے، اس قصیدہ سے متعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ’’’فضائل درودشریف‘‘ میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب قدس سرہٗ کی زبانی ایک قصہ نقل کیا ہے جو نیچے درج کیا جارہا ہے:

مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہ نعتیہ کا قصہ

’’مولانا جامیؒ یہ نعت کہنے کے بعد جب ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کا ارادہ یہ تھا کہ روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہوکر اس نظم کو پڑھیں گے، جب حج کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا تو امیرِ مکہ نے خواب میں حضور اقدس ﷺ کی زیارت کی، حضور اقدس ﷺ نے خواب میں ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ اس کو (جامی کو) مدینہ نہ آنے دیں، امیرِ مکہ نے ممانعت کردی، مگر ان پر جذب وشوق اس قدر غالب تھا کہ یہ چھپ کر مدینہ کی طرف چلے، امیرِ مکہ نے دوبارہ خواب دیکھا! حضور ﷺ نے فرمایا: وہ آرہا ہے، اس کو یہاں نہ آنے دو، امیر نے آدمی دوڑائے اور ان کو راستہ سے پکڑوا کر بلایا، ان پر سختی کی اور جیل خانہ میں ڈال دیا، اس پر امیر کو تیسری مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی زیارت ہوئی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ کوئی مجرم نہیں بلکہ اس نے کچھ اشعار کہے ہیں جن کو یہاں آکر میری قبر پر کھڑے ہوکر پڑھنے کا ارادہ کررہا ہے، اگر ایسا ہوا تو قبر سے مصافحہ کے لیے ہاتھ نکلے گا جس میں فتنہ ہوگا، اس پر ان کو جیل سے نکالا گیا اور بہت اعزاز واکرام کیا گیا۔‘‘ (فضائل درودشریف، ص:۱۱۲، ۱۱۳)

اس قصیدہ کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

۱	زِ مہجوری برآمد جان عالَم	ترحّم یانبیَّ اللہ! ترحّم
۲	نہ آخر رحمۃٌ للعالمینی	زِ محروماں چرا غافل نشینی
۳	بروں آور سرا از بُرد یمانی	کہ روئے تُست صبحِ زندگانی

۴	اگرچہ غرقِ دریائے گناہم	فتادہ خشک لب برخاکِ راہم
۵	تو ابرِ رحمتی آن بہ کہ گاہے	کنی برحالِ لب خشکاں نگاہے
۶	قضا می افگند از راہ مارا	خدارا از خدا در خواہ مارا
۷	کہ بخشد از یقیں اول حیاتے	دہد آنگہ بکارِ دیں ثباتے
۸	کند باایں ہمہ گمراہیٔ ما	ترا اذنِ شفاعت خواہیٔ ما

ترجمہ ومفہوم:

’’۱-آپ کے فراق سے کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ جاں بلب ہے، اے رسولِ خدا! نگاہِ کرم فرمائیے !۔

۲-آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں، ہم بے نصیبوں سے آپ کیسے تغافل فرما سکتے ہیں؟

۳-اپنے سر مبارک کو یمنی چادروں کے کفن سے باہر نکالیے، کیونکہ آپ کا چہرۂ انور نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

۴-اگرچہ میں گناہوں کے دریا میں غرق ہوں، لیکن خشک ہونٹوں کے ساتھ آپ کی گردِ راہ میں پڑا ہوا ہوں۔

۵-آپ چونکہ ابرِ رحمت ہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ کبھی تو تشنہ لبوں پر ایک نگاہِ کرم ڈال دیں۔

۶-تقدیر ہمیں صراطِ مستقیم سے بھٹکا رہی ہے، خدارا! ہمارے لیے خداوندِ قدوس سے دعا فرمائیے!

۷-(دعا یہ فرمائیے) کہ اللہ تعالیٰ اولاً تو ہمیں یقینِ کامل کی زندگی بخشے، اور پھر دینی کاموں میں ثابت قدمی عطا فرمائے۔

۸-(اور یہ بھی دعا فرمائیے) کہ اللہ تعالیٰ ہماری تمام برائیوں کے باوجود آپ کو ہماری شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے۔‘‘

اس قصیدے نے چونکہ بچپن ہی سے اپنے والد ماجد کی کیفیت کو دیکھ کر احقر کو متأثر کر دیا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ کبھی دوسروں سے سن کر اور کبھی خود تنہائیوں میں پڑھتے ہوئے اور حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے نقل کردہ مذکورہ بالا قصہ پر غور کرتے ہوئے اس تأثر میں اضافہ ہوتا رہا، اس پرانی مناسبت نے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ آستانۂ سرکارِ دوعالم ﷺ پر حاضری کے وقت اس قصیدے میں سے چند وہ منتخب اشعار جو زبانی یاد ہو گئے تھے پڑھنے کی کوشش کروں، لیکن ہوا یہ کہ صرف ایک دو شعر رُک رُک کر پڑھنے کے بعد زبان گنگ ہو گئی اور مزید پڑھنے سے اپنی عاجزی ظاہر کر دی۔

زباں گنگ کیوں نہ ہوتی؟ جس دربار کی حاضری کو اللہ تعالیٰ کا مقرب فرشتہ حضرت جبریل علیہ السلام اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہو، جس ہستی سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا ہو کہ:

’’اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو، اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، اس طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو، (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو‘‘۔ (الحجرات:۲)

اور جس ذاتِ اقدس کے دربار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہوتا ہو، اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے متعلق یہاں تک فرمایا ہو کہ: ’’**إذا قام فی مقامک لم یُسمع الناسَ من البکاء** ‘‘یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تو حالت یہ ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے لیے آپ ﷺ کی محراب میں کھڑے ہوگئے تو شدتِ گریہ کی وجہ سے لوگوں کو تکبیر وقرأت سنانے پر قادر نہیں ہوسکیں گے۔ (بخاری شریف، ج:۱،ص:۹۳) اور جن کی مجلس میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بات کرتے ہوئے کانپتے ہوں! ان کے آستانے کے سامنے گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا پندرہویں صدی ہجری کے پُرفتن اور دورِ اُفتادہ زمانے کا ایک سیاہ کار شخص کس طرح لب کشائی کرسکتا ہے؟

بشارتِ غیبی کا ایک واقعہ

احقر اس مضمون ’’حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری‘‘ کو اپنی تحریری اور ذہنی یادداشتوں کی روشنی میں ترتیب دینے لگا تھا اور شروع سے ’’روضۂ اقدس پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت‘‘ والے عنوان تک لکھ چکا تھا، اور مذکورہ عنوان کے تحت بھی کچھ حصہ لکھ چکا تھا اور مزید لکھنے میں مصروف تھا کہ اسی دوران بروز منگل ۲۸ رذوالحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۳ را کتوبر ۲۰۱۵ء فجر کی نماز کے بعد اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اسکرین پر ایک ایسا نمبر ظاہر ہوگیا جو میرے پاس محفوظ نہ تھا، میری پوری توجہ چونکہ روضۂ اقدس پر پہلی حاضری کی یادوں کی طرف مرکوز تھی، اس لیے ایک مرتبہ تو سوچا کہ فون ہی وصول نہ کروں اور اپنی یادوں کے سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دوں، پھر خیال آیا کہ یہ تو کسی مسلمان بھائی کے ساتھ ناانصافی ہوگی، لہٰذا میں نے فون وصول کرکے سلام کیا، اُدھر سے جواب کے بعد آواز آئی:

’’میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری میں آپ کا رفیقِ سفر محمد اشرف علی سرگودھا سے بول رہا ہوں۔‘‘

یہ سننا تھا کہ میری کیفیت کچھ عجیب سی ہوگئی، اس لیے کہ یہ ان ہی تین رفقائے سفر میں سے ایک تھے جن کا ذکرِ خیر اس سے پہلے اس مضمون میں کرچکا ہوں، ایک ایسے موقع پر کہ میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری سے متعلق تقریباً اٹھائیس سال گزرنے کے بعد مضمون لکھنے میں مصروف تھا اور مواجہہ شریف پر حاضری کا موضوع چل رہا تھا، غیر متوقع طور پر مولانا کی آواز اور ان کی زبان سے حرمین شریفین کا تذکرہ سن کر اُسے فالِ نیک اور بشارتِ غیبی سمجھا، اور مولانا کو اُسی وقت اس صورتِ حال سے آگاہ کردیا کہ احقر اس وقت مواجہہ شریف پر حاضری کے عنوان کے تحت کچھ لکھ رہا تھا اور آپ

میری یادوں میں میرے ساتھ تھے، مولانا نے فرمایا کہ: میں نے اپنی مسجد میں فجر کی نماز پڑھائی، پھر درسِ قرآن دیا، اس کے بعد اُسی جائے نماز پر بیٹھا ہوا نمازِ اشراق کے انتظار میں کچھ وظائف واَوراد پڑھ رہا تھا کہ آپ کی رفاقت میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری اور جبلِ نور پر آپ کے چڑھنے کا انداز یاد آیا اور اس یاد نے آپ کو فون کرنے پر مجبور کردیا، چنانچہ جائے نماز ہی سے آپ کو فون کررہا ہوں، اس موقع پر جانبین پر کچھ رِقّت کی کیفیت بھی طاری ہوگئی، اور ہر ایک نے دوسرے سے دعا کی درخواست پر بات ختم کردی۔

واضح رہے کہ ماہِ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو یہ یادگار سفر ہوا تھا، اور اس کے بعد تادمِ تحریر تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران مولانا سے صرف دو مختصر ملاقاتیں ہوچکی ہیں، اور چند سال قبل ایک مرتبہ فون پر بھی رابطہ ہوا تھا، اس کے بعد نہ تو آپس میں کوئی مستقل رابطہ تھا، نہ ہی میرے اس مضمون کی مولانا کو کوئی خبر تھی، اس کے باوجود اچانک رابطہ کرنے کو بشارتِ غیبی اور فالِ نیک کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو ہر پڑھنے والے کے لیے مفید اور لکھنے والے کے لیے دارَین کی کامیابی اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا ذریعہ بنادے۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرقد کے سامنے

مواجہہ شریف پر حاضری کے بعد تقریباً ایک ہاتھ کے بقدر داہنی طرف کو کھسک کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دبی ہوئی آواز میں سلام پیش کرنے کی کوشش کی، اس موقع پر یہ تصور قائم رہا کہ یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق اس کے آغاز کے ساتھ ہی کی تھی، اور آپ ﷺ کی دعوت پر ابتداء ہی سے لبیک کہا تھا، اور جب مسلمانوں پر مکہ مکرمہ کی زمین اتنی تنگ کردی گئی کہ اپنے دین پر قائم رہنا اُن کے لیے شوار ہوگیا اور وہ اللہ ورسول ﷺ کے حکم سے ہجرت کرنے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ امتیاز رہا کہ جب اُنہوں نے نبی کریم ﷺ سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی، آپؐ نے فرمایا: ''**لاتعجل لعلّ اللّٰہ أن یجعل لک صاحبًا**''یعنی آپ اکیلے ہجرت کرنے کی جلدی نہ کیجئے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی رفیقِ سفر بھی عنایت فرمادیں۔ (البدایۃ والنھایۃ، ج:۲، ص:۵۶۰، ط: دارالفکر بیروت)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ وہ عظیم الشان رفیقِ سفر آپ ﷺ ہی ہوں گے، چنانچہ اس وقت رُک گئے اور پھر آپ ﷺ کی معیت میں ہجرت کرنے کی سعادت حاصل کرلی، اور تین دن تک ''غارِثور'' میں بھی ساتھ رہے، جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح فرمایا ہے:

''إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ

إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لاَ تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔‘‘ (التوبۃ:۴۰)

’’یعنی اگر تم ان کی (نبی ﷺ کی) مدد نہیں کرو گے (تو کوئی پروا نہیں کیونکہ) اللہ نے تو اس وقت ان کی مدد کی جب کافروں نے اس حال میں ان کو (مکہ سے) نکالا تھا جب وہ دو آدمیوں میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ کچھ غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔‘‘

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غارِ ثور کے اندر نبی کریم ﷺ کے ساتھی ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جاں نثار خادم ہونے کا شرف بھی حاصل کرلیا، انہوں نے نبی کریم ﷺ کے آرام وراحت کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا، غارِ ثور میں نبی کریم ﷺ کے قیام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت گزاری سے متعلق اصحابِ سِیر نے جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ نے ’’تفسیر عثمانی‘‘ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

’’یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوّف چٹان ہے، جس میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا، صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا، اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اندر جاکر اُسے صاف کیا، سب سوراخ کپڑے سے بند کیے کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے، ایک سوراخ باقی تھا، اُس میں اپنا پاؤں اَڑا دیا، سب انتظام کرکے حضور ﷺ سے اندر تشریف لانے کو کہا، آپ ﷺ صدیق کے زانو پر سر مبارک رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پاؤں ڈَس لیا، مگر صدیقؓ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے، مبادا حضور ﷺ کی استراحت میں خلل پڑے، جب آپ ﷺ کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے لعابِ مبارک صدیقؓ کے پاؤں کو لگا دیا، جس سے فوراً شفا ہوگئی۔ (تفسیر عثمانی، سورۃ التوبۃ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانیوں اور اخلاص کا احاطہ کرنا تو بہت مشکل ہے، البتہ مندرجہ ذیل ایک واقعہ جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے، نمونہ کے طور پر درج کیا جارہا ہے، جس سے ان کے اخلاص کا ایک حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (غزوۂ تبوک کے موقع پر) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کرنے کا حکم دے دیا اور اتفاق سے اُس وقت میرے پاس کچھ مال موجود تھا، میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ آج میں ابوبکرؓ سے (اس کارِ خیر میں) سبقت کروں گا اگر یہ ممکن ہوسکا، پس میں نے اپنے پورے مال میں سے آدھا مال لاکر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ اپنے گھر والوں کے لیے کتنا باقی رکھا؟ میں نے کہا جتنا لایا ہوں اتنا ہی ان کے لیے بھی چھوڑا

ہے، اور (اتنے میں) ابوبکرؓ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سارا ہی لے کر حاضر ہوئے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اے ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لیے کتنا باقی رکھا؟ صدیقؓ نے کہا: ان کے لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول کو باقی رکھا ہے، (یعنی اللہ و رسول کی رضامندی ان کے لیے کافی ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ میں ابوبکرؓ سے کبھی بھی کسی کارِ خیر میں سبقت نہیں کر سکتا۔'' (ترمذی شریف، ج:۲،ص:۲۰۸، ط: قدیمی کتب خانہ)

مذکورہ بالا روایت کا مفہوم علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ''بانگِ درا'' میں ''صدیقؓ'' کا عنوان لگا کر اپنے مخصوص اور مؤثر انداز میں ایک قصیدے کے اندر بیان کیا ہے، روایتِ بالا کے اندر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آخری جملہ کے مفہوم کو علامہ نے اپنے قصیدے کے آخری شعر میں جس انداز پر ذکر کیا ہے وہ شعر ایسا ہے کہ احقر جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی محبت، وفاداری، غارِ ثور میں رفاقت اور پھر آخری آرام گاہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں جگہ پانے کی سعادت کا تصور کرتا ہے تو وہ شعر ضرور یاد آتا ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اسلامی زندگی پر اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے آغاز ہی سے وہ شروع ہوتی ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تقریباً ۲۳/سال تک مسلسل آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ سایہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے، اس دوران صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہر ہر نیکی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے، اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو جاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت سنبھالنے کے لیے تقدیرِ خداوندی ان کو مزید دو سال تین مہینے کی مہلت دے دیتی ہے، اور جیسے ہی صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی ۶۳/سال تک پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک کے مطابق ہو جاتی ہے تو وہ خلافت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کرتے ہوئے اپنی جان کو مولائے کریم کے سپرد کر دیتے ہیں، اور تقدیرِ خداوندی آخری آرام گاہ کے طور پر ان کو جوارِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جگہ عطا کرتی ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی پر غور کرنے والوں کو وہ حدیثِ نبوی بھی خود بخود یاد آتی ہے جس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو جنت میں داخل ہونے کے لیے اس کے آٹھوں دروازوں سے بلائے جانے کی بشارت سنائی گئی ہے۔ (بخاری شریف، ج:۱،ص:۵۱۷، ط: قدیمی کتب خانہ)

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مرقد کے سامنے

آستانۂ صدیقی پر حاضری کے بعد پھر ایک ہاتھ کے بقدر داہنی طرف کھسک کر حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ کو پست آواز اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ سلام پیش کرنے کی کوشش کی، اس موقع پر یہ تصور قائم رہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل خصوصی دُعا فرمائی تھی:

''أللّٰهم أعِزَّ الاسلام بأحبّ هذين الرجلين إليک بأبی جهل أو بعمر بن الخطاب۔''

یعنی ''اے اللہ! اسلام کو قوت پہنچا ابوجہل اور عمر بن الخطاب میں سے جو شخص آپ کے نزدیک زیادہ محبوب ہو اس کے ذریعہ۔'' (ترمذی شریف، ج:۲،ص:۲۰۹، ط: قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ دُعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں قبول کر کے یہ واضح فرمادیا کہ میرے نزدیک ان دونوں میں سے محبوب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں، اس خصوصی دُعا کے بعد صرف یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی دولت سے نوازا، بلکہ اسلام کو ان کے ذریعہ تقویت بھی پہنچائی۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مازلنا أعزّةً منذ أسلم عمرؓ۔'' یعنی ''جب سے حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا ہم برابر طاقتور اور باعزت رہے۔'' (بخاری شریف، ج:۱،ص:۵۲۰، ط: قدیمی کتب خانہ)

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام دین کے لیے قوت بنا، اور ان کی ہجرت اسلام کے لیے کامیابی اور مدد کا ذریعہ بنی، اور ان کی خلافت رحمت ثابت ہوئی، اللہ کی قسم! ہم خانہ کعبہ کے پاس اعلانیہ طور پر نماز پڑھنے پر قادر نہیں تھے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، اور جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو مشرکین کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم علانیہ طور پر خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے لگے۔'' (کنز العمال، ج:۶،ص:۲۶۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بے شک اللہ نے عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں حق کو جاری کر دیا ہے۔''

آگے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی ایسا اہم معاملہ سامنے آتا کہ لوگ اس میں اپنی آراء ظاہر کر دیتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنی رائے ظاہر کر دیتے تو قرآن اس رائے کے مطابق نازل ہوتا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دے چکے ہوتے۔ (ترمذی شریف، ج:۲،ص:۲۰۹، ط: قدیمی کتب خانہ)

اور بخاری و مسلم کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تین احکام میں اللہ کے منشأ کے مطابق میری رائے نکلی: مقام ابراہیم، حجاب اور بدر کے قیدیوں سے متعلق۔''

(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، ص:۵۵۸، ط: قدیمی کتب خانہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اہلِ باطل پر ہمیشہ ان کا رعب و دبدبہ قائم رہتا تھا، اور ان کے مقابلہ کے لیے اہلِ باطل تیار نہیں ہو سکتے تھے، اور اگر کبھی مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ بھی

ہو جاتے تو شکست ہی ان کی مقدر بن جاتی، عام اہلِ باطل کو تو چھوڑ یئے! شر و فساد کا سرغنہ اور تمام برائیوں کی بنیاد اور کفر و شرک کا سپہ سالار ابلیس لعین بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خوف سے لرزہ براندام ہو کر راستہ بدل لیتا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

’’والذی نفسی بیدہٖ مالقیکَ الشیطان قطُّ سالکاً فجًّا إلا سلک فجًّا غیرَ فجّک۔‘‘

’’قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! شیطان جب بھی کسی گلی میں چلتا ہوا آپ کا سامنا کرتا ہے تو (آپ کے رعب سے) اس گلی کو چھوڑ کر دوسری گلی سے چلنے کو اختیار کرتا ہے۔‘‘ (بخاری شریف، ج:۱،ص:۴۶۵)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عدل و انصاف کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جو تا روزِ قیامت آنے والے تمام اربابِ اقتدار کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں، کاش! مسلمانوں کے حکمران بلکہ ہر وہ مسلمان جس کو ادنیٰ سا اقتدار بھی حاصل ہو، چاہے کسی محکمہ کا ہو یا کسی ادارے کا، ادارہ بھی چاہے دینی ہو یا دنیوی! یہ تمام حضرات اگر فاروقِ اعظمؓ کے عدل و انصاف کے واقعات اس نیت سے پڑھ لیتے کہ ہمیں ان کے طریقوں کو اپنانا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ’’علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین۔‘‘ یعنی ’’لازم پکڑو میرا طریقہ اور راہِ راست پر چلنے والے راہِ حق پانے والے میرے خلفاء کا طریقہ۔‘‘ (ابوداؤد شریف، ج:۲،ص:۲۸۷) کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنتوں کو بھی مضبوطی سے پکڑنا ہے تو وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے اکثر مسائل خود بخود حل ہو جاتے، اور مسلمانوں کا ماحول جس طرح آج کل نظر آ رہا ہے اس سے بالکل مختلف ہوتا۔

اس مختصر مضمون میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف اور زہد و قناعت کے بے شمار واقعات میں سے نمونہ کے طور پر صرف تین واقعات قلمبند کیے جا رہے ہیں:

پہلا واقعہ

’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات حسبِ معمول حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت فرما رہے تھے، اچانک ایک عورت کو دیکھا کہ اس نے اپنے گھر میں پانی سے بھری ہوئی ہانڈی آگ پر چڑھائی ہوئی ہے اور آس پاس چھوٹے بچے ہیں جو رو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریب آ کر پوچھا: اے اللہ کی بندی! یہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: بھوک سے! فرمایا: اس ہانڈی میں کیا ہے؟ کہا: اس میں پانی ہے، البتہ اِن بچّوں کے ذہنوں میں یہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس میں آٹا اور گھی ہے، تا کہ یہ خوشی خوشی میں سو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر رونے لگے، پھر

دار الصدقہ جہاں صدقات کا سامان تھا تشریف لے گئے اور ایک بوری میں آٹا ، گھی ، چربی ، کھجور، کپڑے، اور کچھ سکّے بھر دیئے، اور مجھ سے (اسلم سے) فرمانے لگے کہ: یہ بوری میری پشت پر رکھیے، میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین ! آپ مجھے اٹھانے دیجئے، میں اٹھاؤں گا، فرمایا: اے اسلم ! کیسے ناسمجھ ہو! میں ہی اُٹھاؤں گا، اس لیے کہ قیامت میں مجھ ہی سے سوال ہوگا۔

بہرصورت ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی وہ بوری اُٹھاتے ہوئے اس عورت کے گھر پہنچے اور خود ہی ہانڈی میں کچھ آٹا اور چربی اور کھجور ڈال کر ملاتے رہے اور آگ کو تازہ رکھنے کے لیے ہانڈی کے نیچے پھونکتے رہے، اور چونکہ آپ کی داڑھی کافی بڑی تھی، اس لیے دھواں داڑھی کے درمیان میں سے نکلتا رہا، یہاں تک کہ کھانا تیار کر دیا، پھر اپنے ہاتھوں سے اُن بچوں کو کھلایا، یہاں تک کہ شکم سیر ہوگئے، پھر (ان بچوں کو ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے) درندہ کی نقل اُتارتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھنے اور چلنے لگے (میں تو اس کیفیت کو دیکھ کر حیران ہوا) البتہ ان سے کچھ پوچھنا میرے بس میں نہ تھا، وہ برابر ان بچوں کے ساتھ اسی طرح رہے، یہاں تک کہ وہ بچے بھی کھیلنے اور ہنسنے لگے، پھر مجھ سے فرمایا کہ: اے اسلم! جانتے ہو میں نے درندے کی نقل ان بچوں کے سامنے کیوں اتاری؟ میں نے کہا: نہیں، فرمایا: میں نے ان کو روتے ہوئے دیکھا تھا اور ایسی ہی حالت میں ان کو چھوڑ کر جانا مجھے پسند نہیں تھا، یہاں تک کہ میں نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو میرا دل خوش ہوا۔'' (کنز العمال، ج:۶،ص:۲۸۹،مطبوعہ بیروت)

دوسرا واقعہ

''اسلمؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت کرنے کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا، ہمیں ایک خیمہ نظر آیا جس میں سے ایک خاتون کے رونے کی آواز آرہی تھی جو دردِ زہ میں مبتلا تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب صورتحال معلوم کی تو معلوم ہوا کہ اس غریب خاتون کے پاس (کھانے پینے اور ولادت کے وقت درکار ضروری سامان میں سے) کچھ بھی نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور تیز قدموں کے ساتھ اپنے گھر تشریف لے جا کر اپنی زوجہ محترمہ امّ کلثوم بنت علی بن ابی طالب سے کہنے لگے کہ: کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ اللہ آپ کو اجر وثواب عطا فرمادے؟ اور ان کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا، انہوں نے کہا: کیوں نہیں؟ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی پشت پر آٹا اور چربی اور ام کلثومؓ نے ولادت کے لیے درکار ضروری سامان اٹھایا اور دونوں خیمہ کے پاس پہنچے، امّ کلثوم تو اس خاتون کے تعاون کے لیے اندر تشریف لے گئیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے شوہر کے ساتھ باہر تشریف فرما ہوکر ان کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہوگئے، وہ شخص یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ امیر المؤمنین ہیں، تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا، ام کلثومؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پکارا کہ اے

امیر المؤمنین! اپنے ساتھی کو بچے کی مبارکباد دیجئے، امیر المؤمنین کا لفظ سن کر وہ شخص چونک اٹھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے معذرت کرنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوئی بات نہیں، اس کے بعد ان کی ضروریات کا خرچہ بھی دے دیا۔'' (البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۲۱۶)

تیسرا واقعہ

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت جب کہ وہ امیر المؤمنین تھے، دیکھا کہ اپنے کندھوں کے درمیان اپنے کرتے پر تین پیوند اس طرح لگا رکھے تھے کہ بعض دوسرے بعض پر چڑھے ہوئے تھے۔'' (کنز العمال، ج:۶، ص:۲۷۹)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زندگی اور واقعات پر غور کرنے کے بعد ان کی ایسی خصوصیت بھی سامنے آتی ہے جو ان کے بعد سے آج تک نہ تو کسی کو اُس پیمانے پر نصیب ہوئی ہے جس پیمانے پر ان کو حاصل تھی اور نہ ہی آج کے بعد سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کسی کو حاصل ہو سکے گی، اور وہ خصوصیت ہے: ''بے پناہ شجاعت کے ساتھ ساتھ بے انتہاء تواضع'' عام طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اگر کسی کے اندر شجاعت کی صفت موجود ہو تو پھر تواضع کی صفت موجود نہیں ہوتی یا کافی کمزور ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر تواضع کی صفت موجود ہوتی ہے تو پھر شجاعت نظر نہیں آتی، لیکن حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شجاعت کا تو وہ مقام ہے کہ متکبرین کا سرغنہ ابلیس لعین جس نے فرعون کو ''أنا ربّکم الأعلٰی'' کہنے کی تعلیم دی وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت و دبدبہ سے مرعوب ہو کر راستہ بدل لیتا، اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے تو علی الاعلان خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور اِس امت کا فرعون (ابوجہل) اور دیگر سردارانِ قریش ان کو اس علانیہ عبادت سے نہ روک سکے، اور ابن عساکرؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ:

''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنی تلوار و کمان کو لے کر بیت اللہ کے پاس آئے جہاں سردارانِ قریش بیٹھے ہوئے تھے، بیت اللہ کا پورا طواف کیا، پھر مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر مشرکین کی جماعت میں سے جو لوگ وہاں پر موجود تھے ایک ایک کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے یہ چہرے ذلیل ہو جائیں، جس کا ارادہ ہو کہ اس کی ماں اسے ناپید کر دے اور اس کی اولاد یتیم ہو جائے اور اس کی بیوی رانڈ ہو جائے وہ (مجھ کو ہجرت سے روکنے کے لیے) اس وادی کے پیچھے مل لے (لیکن ہوا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب کی وجہ سے) ایک بھی ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نہ جا سکا۔'' (حیاۃ الصحابہؓ، ج:۳، ص:۵۸۴)

شجاعت کے مذکورہ بالا مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع کی یہ حالت

تھی کہ ایک وسیع دولت اسلامیہ کے امیر المؤمنین ہونے کے باوجود پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، اور بے سہارا خاندانوں کی خبر گیری کے لیے اپنی پشت پر ضروری سامان اُٹھا کر لے جانے سے دریغ نہیں فرماتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ شجاعت وتواضع کا اس حد تک امتزاج حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شجاعت وتواضع، عدل وانصاف، زہد وقناعت، انتظامی امور میں اعلیٰ صلاحیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے لیے ایک خصوصی دُعا (جس کا تذکرہ ہو چکا ہے) کی برکت سے ان کے دورِ خلافت میں اسلام کو خوب قوت وترقی حاصل ہوئی اور زیادہ پھیلنے کا موقع ملا، چنانچہ آپ ہی کے زمانہ میں ایران، شام، عراق، قدس، مدائن، مصر وغیرہ سب فتح ہوئے، اور ملّتِ اسلامیہ کا پوری دنیا پر ایک رعب قائم ہو گیا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی آخری تمنا

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اور پھر اپنے دورِ خلافت میں دینِ متین کے لیے بے شمار قربانیاں پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی آخری ایک ایسی تمنا عرض کر دی جس کے تین اجزاء تھے:

پہلا جزء: ''اللہ کی راہ میں شہادت۔''

دوسرا جزء: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ کے اندر موت۔''

تیسرا جزء: ''کسی کلمہ گو کے ہاتھ سے نہیں بلکہ غیر مسلم کے ہاتھ سے شہادت۔''

شروع کے دو اجزاء سے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل دعا نقل کی ہے: ''**أللّٰھم ارزقنی شھادۃً فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک۔**'' یعنی ''اے اللہ! مجھے اپنے راستہ میں شہادت عطا فرما، اور اپنے رسول کے شہر میں وفات نصیب فرما۔''

(بخاری شریف، ج:۱،ص:۲۵۳)

اور تیسرے جزء سے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت زید بن اسلمؒ کے واسطے سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی یہ دعا نقل کی ہے: ''**أللّٰھم لا تجعل قتلی بِیَد رجل یصلی لک سجدۃ واحدۃ یحاجّنی بھا عندک یوم القیامۃ**'' یعنی ''اے اللہ! کسی ایسے شخص کے ہاتھ میرا قتل مقدّر نہ فرما جس نے آپ کے آگے کوئی ایک سجدہ بھی کیا ہو، جس کے سہارے وہ قیامت کے دن آپ کے دربار میں میرے ساتھ جھگڑا کر سکتا ہو۔'' (موطأ امام مالکؒ، ص:۶۷۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کی اس آخری تمنا میں جن تین چیزوں کی دعا مانگی تھی ان کا جمع

ہونا ظاہری اسباب کے اعتبار سے غیر متوقع تھا، اس لیے کہ آپ کے دورِ خلافت کے آخری دنوں میں حق و باطل کے معرکے تو مدینہ منورہ سے ہزاروں میل دور برپا تھے، اور ان ہی دور افتادہ مقامات میں شہادت کی توقع کی جاسکتی تھی اور مدینہ منورہ چونکہ مسلمانوں کا دار الخلافہ تھا اور اس میں مکمل طور پر امن و امان کی فضا قائم تھی تو وہاں پر موت کی توقع تو کی جاسکتی تھی، لیکن کسی کافر کے ہاتھ سے امیر المؤمنین کی شہادت کا ماحول موجود نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کی مخلصانہ دعا کو قبول فرماتے ہوئے اُن تینوں چیزوں کو جمع فرمادیا، اور وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ میں فیروز نام کا ایک مجوسی غلام تھا جس کی کنیت ابولؤلؤ تھی، اس نے بروز چہارشنبہ ۲۶/ذوالحجہ ۲۳ھ کو ایسے وقت میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر خنجر سے پے در پے کئی وار کر کے شدید زخمی کر دیا جب وہ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، ان ہی زخموں کی وجہ سے تین دن کے بعد مدینۃ الرسول (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اندر ہی شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور یکم محرّم ۲۴ھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت سے بھی نوازے گئے۔ مشہور و راجح قول کے مطابق ان کی مدّتِ خلافت دس سال چھ مہینے چار دن رہی، رضی اللہ تعالی عنہ و أرضاہ (جاری ہے)